ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

ماخذ تحقیقی مجلہ

ڈاکٹر ریحانہ کوثر

ایسوسی ایٹ پروفیسر، صدر شعبہ اردو، لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی، لاہور۔

ڈاکٹر شائستہ حمید خان

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، جی سی یونیورسٹی، لاہور۔

ایمن وکیل

لیکچرر اردو، سپیریئر کالج، مانانوالہ۔

انتظار حسین کے افسانوں میں تاریخی و تہذیبی شعور

Dr. Rehana Kausar

Associate professor, Chairperson, Department of Urdu, Lahore Collage for Women University, Lahore.

Dr. Shaista Hameed Khan

Assistant Professor, Department of Urdu, GC University, Lahore.

Aiman Wakeel

Lecturer Urdu, Superior College, Manawala.

Historical and Cultural Consciousness in the Short Stories of Intezar Hussain

Intezar Hussain's fiction is to analyze the situation in a logical way. His talk on visas and passports was in vogue in India and Pakistan, but now global moral contractors and preachers of tolerance are closing the doors of their country to the people out of love for their country. This is the form of blood in which even its shadow seems suspicious. These myths tell the historical situation of Pakistan. The themes of these myths describe the changes that have taken place in the social, cultural, civil and political spheres throughout history. The focus of their attention is our attitude towards the nation. Even superficial reactions to the greatest misfortunes and tragedies are astonishing.

keywords: *Intezar Hussain, Fiction, Shoet Stories, India, Pakistan, Global, Social, Culture, Civil, Political, History .*

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

انتظار حسین نے تقسیم ہند کے بعد لکھنا شروع کیا اور ہجرت کے ٹھیک ایک سال بعد ہی اُن کا پہلا افسانہ "قیوما کی دوکان" ادب لطیف میں شائع ہوا اور مقبول بھی ہوا۔ اس کے کم و بیش پانچ سال بعد "گلی کوچے" منظر عام پر آیا۔ انتظار حسین جب اُردو فکشن کی دنیا میں آئے تو اُنھوں نے یہاں کے تنگ راستوں کو کشادہ شاہراہ کی شکل دینے کی کوشش کی اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہندوستان میں قرۃ العین حیدر کا نام نمایاں ہے تو ہمارے ہاں انتظار حسین بھی اُردو فکشن میں سر فہرست ہیں۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے افسانوی ادب میں تاریخ، تحقیق اور خاص طور پر ہندوستانی تاریخ کی بازیافت کی کوشش کی جبکہ انتظار حسین نے اپنے افسانوں میں پاکستانی تہذیب کی شکست و ریخت کا ذکر کیا ہے اور پاکستانی تہذہب کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے ہاں اجتماع کی بجائے فرد کی بے چارگی اور اخلاقی و روحانی اقدار کے زوال کی کہانی ملتی ہے اور یہ کہانی انتظار حسین کے پہلے افسانوی مجموعہ "گلی کوچے" کے کرداروں سے لے کر اُن کے آخری مجموعے کے افسانوں کے کرداروں تک نظر آتی ہے۔

"گلی کوچے" کے کرداروں کے حوالے سے بات کی جائے تو بظاہر اُن کے ہاں کوئی مسائل نہیں۔ یہ اپنی زندگی روایتی انداز میں بسر کرتے ہیں۔ پھر اچانک ظاہری واقعات سے وہ متاثر ہونا شروع ہوتے ہیں۔ رونما ہونے والے واقعات کا بظاہر ان اشخاص سے تعلق نہیں مگر یہ ان کی سوچوں اور فکروں پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں۔ اس مجموعے کا پہلا افسانہ "قیوما کی دوکان" ہے جس میں ایک سادہ اور فطری معاشرے کا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔ جس میں بلاتفریق مہذب لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ "قیوما کی دوکان" گویا ہندوستان کی تہذیب تھی۔ یہاں بستی کے مذکورہ کردار آکر مجلس لگاتے اور اپنی روزمرہ کی زندگی سے لطف کشید کرتے۔ قیوما خود دودھ میں پانی ملاتا تھا۔ رمضان قصائی بھینس کا گوشت بیل کا کہہ کر بیچ لیتا تھا۔ جب دوملکوں کا ذکر ہونے لگا تو عام عوام بھی متاثر ہوئی اور قیوما کی دوکان والی مجلس میں بھی بحث و مباحثہ شروع ہو گیا جس میں مسلم لیگ، کانگریس زیر بحث آئیں۔ جناح صاحب نماز نہیں پڑھتے، داڑھی نہیں رکھتے۔ ایسی باتیں اُس زمانے کی عام سوچ کی آئینہ دار ہیں۔ جب کرفیو لگا تو ہر طرف سراسیمگی تھی اور قیوما کی دوکان بھی بند ہو گئی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "چوک ننگا، مسجد کے پیچھے والی گلی ننگی، چھتیں ننگی، آسمان ننگا، قیوما کی دوکان کا پٹرا بھی ننگا، ہم خود بھی ننگے ہو گئے تھے۔" (۱)

ISSN(**P**): 2709-9636 | ISSN(**O**): 2709-9644
Volume 3, Issue 2, (April to June2022)

تہذیب کا دامن چھوڑ کر وحشی پن پر اُتر آنا، دوبارہ بستی سے جنگلوں کی طرف مراجعت ہی قرار دی جا سکتی ہے۔ روایات کو ترک کرنا، ترقی نہ کرنا، درختوں پر رہنا، ستر پوشی نہ کرنا، کچا گوشت کھانا جس سے زندگی کے سفر کا آغاز ہوا تھا اُسی منزل پر واپس پہنچ جانا قیوما کی دوکان تہذیب کا سمبل اور خود قیوما اس کا نمائندہ کیونکہ اس کی شخصیت سے پوری تہذیب جلوہ افروز ہے:

> "قیوما کا استقلال، بے نیازی یہ پابندی وقت تاریخ میں یادگار رہے گی اور اس کی دوکان تو خود بہت بڑی تاریخ کو اپنے سینے میں بند کیے ہوئے تھی۔" (۲)

"خرید و حلوہ بیسن کا" ایسا افسانہ ہے جس میں مسلمانوں کی روایتی عقیدت مندی اور خوش فہمی کا ذکر ہے۔ حالات چاہے کیسے بھی ہو جائیں ہماری شفاعت بھی ہو گی اور جنت میں سیدھے جائیں گے۔ بس یہاں حلوہ ہی کھاتے رہو یہ اجتماعی کردار پر طنز ہے۔ مسلمانوں نہ گھبرائو شفاعت برملا ہو گی۔ پڑھو کلمہ محمد کا خرید و حلوہ بیسن کا۔ سب کچھ لٹا کر ہجرت کرنے والے یہی آواز سن رہے تھے۔ ان کا حالات کے ساتھ نہ چلنا یا نہ چل سکنا یہ ایک المیہ تھا جس کا خمیازہ بھگتا گیا۔ تہذیب کے بارے میں تذبذب تھا جس کی وجہ سے پورا خطہ خاک چھانتا رہا اور نسلوں کو پریشان حال چھوڑ گیا۔ نئی نسل کے افراد ان تمام چیزوں سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس پر مصنف دُکھی ہو جاتا ہے کیونکہ وہ چاہتا ہے کہ نئی نسل کا اپنی پرانی روایات اور اقدار سے رشتہ جڑا رہے۔

انتظار حسین کا مجموعہ "کنکری" کے افسانہ "انجنہاری" میں مٹی کو ایسے برتا گیا کہ پوری کہانی اس کی سوندھی سوندھی خوشبو سے مہک اُٹھی۔ تہذیب کے اجزا مثلاً بازار اور اس میں سجی انواع واقسام کی دوکانیں، مداری کا تماشا، مجلس عزا، میلاد، سیاسی جلسہ غرض یہ کہ معاشرے کے مختلف اکٹھ اس کہانی میں جلوہ گر ہیں۔ مجلس سجی ہوئی ہے، ہر طرف شور وغل ہے مگر بن پر رقت طاری نہیں ہوتی۔ اس کا دھیان مجلس کے ختم ہونے کے بعد بٹنے والے تبرک اور نیاز پر ہے۔ یہ وہ المیہ ہے جس کی وجہ سے اس تہذیب کے اُجڑنے پر کچھ لوگ رونا چاہ رہے تھے۔ ذہن پر دبائو ڈال کر وہ یکسوئی سے کوئی ایسا فقرہ سننا چاہتے تھے جس سے ان پر غم کی کیفیت طاری ہو۔ اجتماعیت سے بچھڑ کر تنہا رہ جانے کا درد ایسا ہے کہ اس پر کوڑھ مغز اور مادہ پرست بھی اداس اور غمگین ہو جاتے ہیں۔ گلستان کے اُجڑنے کی کہانی جب سناتے ہیں تو محفل گریہ کیوں نہیں کرتی:

"۔۔۔شاہد صاحب اس رپورتاژ کو پورا نہیں پڑھ سکے۔ پڑھتے پڑھتے اچانک اُن کی آواز بھر آئی۔ پھر رقت طاری ہوگئی اور رقت بھی ایسی کہ ہڑکی بندھ گئی۔ پھر وہ پوری محفل ہی محفل گریہ بن گئی۔ بس ہم دو غیر دہلوی، مَیں اور عسکری صاحب اپنی خشک آنکھوں کے ساتھ دم سادھے بیٹھے رہے۔" (۳)

نئی نسل کو کیسے شریک محفل کیا جائے یہ رقت کس ذریعے سے اُن پر طاری ہو۔ اس نسل کا بھی تو قصور نہیں ہے۔ جس بلبل نے بہار دیکھی ہوئی ہو وہی خزاں پر نوحہ کناں ہوگی۔ جس بدنصیب کے کان فضائل سننے سے محروم رہے ہوں اس کا سینہ مصائب کے اثر سے کیا معمور ہوگا۔ اس کہانی میں جو تاثر ابھرتا ہے وہ تاریخی اور تہذیبی سچائی ہے۔ ایک تو اس خطہ کے سادہ لوح عوام اور دوسرے مجمع لگا کر لوگوں کی جیب صاف کر کے چلتے بنے ہیں۔ اس میں سیاسی لیڈر، مذہبی مبلغ اور عطائی وغیرہ جیسے کئی روپ دھارے گئے ہیں۔

انتظار حسین فقط تاریخ و تہذیب کے خارج سے نتائج مرتب نہیں کرتے بلکہ ان کا ہر فن پارہ انسانی نفسیات سے بھی بحث کرتا ہے۔ افسانہ "محل والے" زمانہ عروج کی یادوں کا قصہ ہے۔ ہجرت کے بعد جج صاحب کا کنبہ جب پاکستان آیا تو صندوق میں سے جج صاحب کی تصویر کو غائب پاتے ہیں۔ خاندان کا بھرم کسی ایک شخصیت کی وجہ سے بنا رہتا ہے۔ خاندان اکٹھا اور منظم رہتا ہے، کوئی فرقہ فساد نہیں ہوتا۔ یہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی جانب اشارہ ہے۔ محل، لال قلعہ اور جج صاحب آخری مغل بادشاہ کی یاد دلاتے ہیں۔ اس وقت تک کم از کم علامتی اتحاد تو قائم تھا۔ ان کی آنکھ بند ہوتے ہی سارا خاندان تیلیوں کی طرح بکھر گیا۔

"ساتواں در" میں کبوتروں کا بیان ہے۔ گھر کی کگنی پر بہت سے کبوتروں کے جوڑے رہائش پذیر تھے۔ چھوٹے چچا نے فائر کر کے ایک گرا لیا، پھر سبھی کبوتر خوف سے اڑ گئے۔ امن کا ماحول ہو تو فطرت اپنے جوبن پر رہتی ہے لیکن اگر اس میں دہشت ناکی اور خوف پھیلا دیا جائے تو ہر چیز درہم برہم ہو جاتی ہے۔ جب تلوار اور تیر سرزمین ہند کے سینے پر آزمائے جاتے رہے تو وہ یہ گھاؤ برداشت کرتی رہی۔ تہذیب کی ٹہنیوں، پھل پھول کو جزوی نقصان پہنچتا رہا مگر بارود کی گھن گرج اور آگ نے شجر تہذیب کو ہی جلا ڈالا۔ اس فائر سے پہلے کبوتروں کی ہجرت سے قبل گھر کا نقشہ کیا تھا اور کیا رہ گیا:

> ”ہمارے گھر میں مہمان پر مہمان اتر تا تھا اور چولہا چوبیس گھنٹے گرم رہتا تھا مگر اس فائر کے بعد تابڑ توڑ ایسی پریشانیاں آئیں کہ جما جمایا گھر تنکوں کی طرح بکھر گیا۔“ (۴)

انتظار حسین کے ہر افسانے میں تہذیب سے وابستہ اشیا بھی منظرِ عام پر آتی ہیں۔ ایسی چیزوں کا نام فقط کتابوں اور کہانیوں میں ملتا ہے۔ کنواں، بیل، رہٹ، خربوزوں والی باڑی، مور کی نغمہ آگئیں جھنکار، دھرم شالہ، پیتل کی لٹیا، نیم کا درخت، آموں کے باغ، بھٹ، غار جیسے الفاظ افسانہ ”جنگل“ میں نظر آتے ہیں۔ ”جنگل“ کو انتظار حسین نے عموماً تہذیب کے استعارے کے طور پر بیان کیا ہے۔

اس لیے سائنسی دور کی ایجادات جس میں جنگل کا کوئی عنصر شامل نہیں۔ درختوں کے کٹنے اور سڑکیں و شاہراہیں بننے میں ہماری تہذیب کو کافی نقصان ہوا۔ اُنھوں نے جنگل کو فنکار کی آخری پناہ گاہ بھی قرار دے رکھا ہے۔ جنگل سے وابستہ غیر مرئی چیزیں مثلاً جن، دیو، چڑیل، جادو نگری، حیرت، خوف بھی فطرت کے عناصر کے طور پر ان کی کہانیوں اور افسانوں کا حصہ ہیں۔

افسانہ ”کنکری“ کے موضوع کو دیکھا جائے تو یہ صرف ایک لفظ نہیں ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کی تاریخ میں یہ ایک بلیغ تلمیح ہے۔ زمین میں ہر چیز کا مٹی سے پیدا ہونا اور پھر مٹی میں مل جانا بھی کنکری سے فوراً ذہن میں آتا ہے۔ کبوتروں اور فاختائوں کو کنکریوں سے تشبیہ دینا بھی اسی طرف اشارہ ہے:

> ”فطرت سے محبت شاعر و ادیب کا طرۂ امتیاز ہے ہی عام سلیم الطبع شخص بھی اس معاملے میں حساس واقع ہوئے ہیں۔ میرزا ادیب نے حاجی ابراہیم نامی ایک صاحب کے بارے میں لکھا ہے کبھی کبھی اپنے عزیز سے ملنے کے لیے یہاں آجاتے تھے۔ لڑکوں کو شاخیں توڑنے سے منع کیا اور اس کے ساتھ ہی تنبیہ بھی کر دی کہ اگر تم شاخیں توڑنے سے باز نہ آئے تو درخت تم سے ناراض ہو جائے گا اور تمہیں ضرور اس کی سزا دے گا۔“ (۵)

انتظار حسین ان پرندوں اور جانوروں کا سہارا لیتے ہیں۔ نوحؑ کا کبوتر، سلمانؑ کا ہدہد، یونسؑ کی مچھلی، رام چندر جی کی گلہری، مہاتما کا کچھوا سمیت کئی جانور وغیرہ نئے مفاہیم کے ساتھ ان کے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔

اُنھوں نے فرد اور تہذیب کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ٹھہرایا ہے۔ تہذیب سے فرد کی پہچان ہے اور تہذیب ہی سے سماج تشکیل پاتا ہے اور معاشروں کے مجموعی کردار تہذیبوں کی بنت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

انتظار حسین کا کہنا تھا کہ اپنے لکھے ہوئے کو Review کرنا صحت مند علامت نہیں ہے۔ نیکی کرتے جاؤ دریا میں ڈالتے جاؤ سچ مچ نیکی ہوگی تو تیر کر اوپر آجائے گی۔

افسانہ "قدامت پسند لڑکی" میں تہذیب مغرب پر طنز کرتے ہیں جس سے اپنی تہذیب کی عظمت کا تصور اُبھرتا ہے۔ سید حسن ان کا ایک کردار ہے۔ وہ لندن میں رہ کر آئے۔ تہذیب مغرب سے مستفید بھی ہو رہے تھے مگر اپنی ثقافت سے جڑے ہوئے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے انگریزی پھولوں کی کیاری میں ایک قلم موتیے کی بھی لگا رکھی تھی مبادا مشرقی کلچر فراموش ہو جائے۔ لکھتے ہیں:

> "یہ مغربی طرز کے ہوٹلوں میں بیٹھتے تھے مگر اپنے پاس مہاتما بدھ کی مورتی بھی رکھی ہوئی تھی۔ صادقہ زین العابدین نے بدیسی پھولوں پر اعتراض کیا ان میں تو مہک ہی نہیں ہے۔" (۶)

یہ وہ شعور ہے جس سے قاری کو آگاہی ملتی ہے۔ یہاں پرانی تہذیب بیگانگی کا اظہار ہے۔ موتیا کی ان بے بو پھولوں کے درمیان موجودگی مشرقی تہذیب کی خوشبو کا اعلان ہے۔ صادقہ کا محرم میں کالی قمیض پہننے پر کچھ لوگوں کو اعتراض تھا تو سیّد صاحب کی زبانی وہ فقرہ کہلوایا گیا جو تہذیبی شعور میں رچا بسا ہوا تھا۔ محرم میں کالی قمیض پہننا مذہب نہیں ہے، تہذیب یا کلچر ہے۔ مہاتما بدھ، موتیا اور محرم یہ تینوں برصغیر کی تہذیب کے استعارے ہیں۔

درگزر کرنا، آپسی محبت اور بھائی چارہ مشرق کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ ان پر مغربی تہذیب کا رنگ چڑھ جانا بھی خطرناک تھا مگر اپنی روایات کو یکسر بھول جانے والوں کی نسبت اس طرح کے لوگ بہر حال غنیمت تھے۔ اس کہانی میں بعض ایسی صداقتیں بھی ہیں جو امت مسلمہ کے لیے لمحۂ فکریہ ہیں۔ اُردو ادب کے لیے وہ نشانِ راہ ہیں اور وہ ہے سیّد حسن کی زبانی تاریخی جملہ ذوالجناح اور عَلم، صلیب سے بڑے سمبل ہیں۔

انتظار حسین کے افسانوں میں دِل پگھلا دینے والے اشاروں اور علامتوں کے ذریعے بصیرت افروز سبق یاد دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاریخی احساس سے لکھی کہانیاں گرد و پیش سے جتنا مواد اکٹھا کرتی ہیں اس سے کہیں زیادہ بیتے زمانوں کو گرفت میں لیتی ہیں۔ دیوار کے اس پار انسان ہیں اور "یاجوج ماجوج" نے دیوار کو چاٹ کر

انسانوں کو کھاتا ہے۔ مگر یہاں یہ منصب خود بنی آدم نے سنبھال لیا ہے۔ گز بھر لمبی زبانیں لیے وہ اپنے ہی بھائی بندوں کو نگل رہا ہے باہمی نفاق نے اجتماعی اضطراب کی شکل اختیار کر کے جنت کو جہنم میں بدل دیا ہے۔ اس مقام پر آلِ یاجوج اور آلِ ماجوج بھی دم بخود ہیں۔ سماجی کی اس سے خراب حالت کی مثال شاید ہی کوئی اور پیش کی گئی ہو، جو اس مجموعے میں ہے۔ درپردہ یہاں اس شخصیت کی کھوج کی گئی ہے جو اس دھرتی کا فرزند تھا، جو تہذیب یافتہ بھی تھا اور جس کی ذات خود تہذیب کی قائم مقام تھی۔ اپنے ملک کی معاصر صورت حال پر بھی جابجا تبصرے ملتے ہیں۔ تحریر یہاں بے معنی ہو جائے اور دانشور کی بات پر توجہ دینا عبث ہو اور اس پر مستزاد ادب کو پراپیگنڈے کا آلہ کار بنا دیا جائے، وہاں ٹھہرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ مہاتما کی کہانیوں سے استفادہ اور ان کا اسلوب دراصل ایک ایسا وعظ ہے جو تبلیغی رنگ کے بغیر اثر دکھاتا ہے۔ اگر غلطی ہو جائے تو وقت کا تقاضہ ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے یا پھر کم از کم دہرایا نہ جائے۔ راجہ کے کتے گناہ گار تھے اور ہمارے بے قصور مگر دونوں کتے چیلے کو کہا گیا۔ پچھلے جنم میں شمشان گھاٹ کا کتا میں تھا۔ چیلوں نے سوال کیا، گروجی راج محل والے کتے کا کیا بنا؟ فرمایا وہ آج بھی کتے ہی ہیں۔ چاہیے تو تھا کہ تاریخ سے سیکھ کر آنے والی نسل کو ارتقائی منزلوں سے روشناس کروایا جاتا۔ افسانہ نگار نے ان واقعات کو ایک ساتھ بیان کر کے تاریخی حقائق پر پڑی گرد جھاڑنے کی کوشش کی ہے۔

"خیمے سے دور" انتظار حسین کے افسانوی مجموعے میں اندیشے، وسوسے، خطرات اور خوف کی فضا سے کرداروں کا آمنا سامنا رہتا ہے۔ پہلی کہانی میں حالات کے ستم رسیدہ چند دوست ایک جگہ کمرے میں گئے۔ ساتھیوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کی آپس کی گفتگو سے ان کی نفسیاتی حالت کے ساتھ ساتھ بیرونی حالات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ جانے والوں کی واپسی کے بارے تذبذب کا شکار ہیں۔ ایک ساتھی دوسرے ساتھی کو باہر جانے کا کہتا ہے۔ جواب ملتا ہے:

> "میرے یار تجھے باہر کے حالات کا اندازہ نہیں ہے۔ ہم یوں بے سوچے سمجھے نکل کھڑے ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ پہلا بولا میرے دوست تجھے باہر کے حالات کا تو اندازہ ہے، اندر کے حالات کا اندازہ نہیں ہے۔ اب تو مجھے دو ٹانگوں پر کھڑا ہونا دوبھر لگتا ہے، چلنے کی خواہش ہی ختم ہ گئی۔" (۷)

انتظار حسین برطانوی استعمار اور مغربی تہذیب کے سخت ناقد ہیں۔ جہاں پر بھی دیسی کلچر پر کوئی آنچ آئی اُنھوں نے اس کو اپنے فن میں اُجاگر کیا۔ انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستانی سماج میں جو سیاسی بیداری یا آزادی کے نام پر مختلف جماعتیں اور جتھے وجود میں آرہے تھے، انتظار حسین اُن کی جڑیں تلاش کرنے میں سرگرداں تھے۔ اس کشمکش کا نتیجہ گروہوں اور ٹکڑوں کی صورت میں نکلا۔ مشرقی تہذیب ہی تھی جس کے دامن میں سب پناہ لیے ہوئے تھے اور اسی کے اندر رہ کر اسی کی جڑیں کاٹی جارہی تھیں۔ کہانیوں میں کرداروں کے تضادات سے پردہ چاک کیا گیا ہے۔ اُنھوں نے ایک ایک سطر میں کئی کئی تاریخی سچائیاں کاغذ پر اُتاری ہیں۔ جب رویے تبدیل ہوں تو چہرے بھی بدل جاتے ہیں جو خصلت ہونے کے مترادف ہے۔ پھر اپنی محبوبہ بھی نظریں پھیر لیتی ہیں اور پہچاننے سے صاف انکار کر دیتی ہے۔ یہی ہندوستان کے اس تہذیبی عمل کے شکست و ریخت کا نقشہ ہے کہ جب آدمی کی شخصیت کرچیوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک وہ ہنگامہ تھا جس میں تہذیب بربریت کے نشانے پر تھی اور دوسرا وہ ہیجان تھا جو انسان کے باطن میں موجزن تھا۔ ہر جگہ جو مسئلہ ابھر کر سامنے آتا ہے وہ گمشدہ پہچان کا ہے۔ ان کہانیوں میں تاریخ اور تہذیب کے میل جول سے لاشعور کو شعور کے ساتھ جوڑنا مقصود ہے۔ شخصیت کا ادھورا پن دماغ کو مفلوج کر دیتا ہے۔

انتظار حسین کے افسانے حالات کا تجزیہ منطقی انداز میں کرتے ہیں۔ ویزا اور پاسپورٹ پر ان کی کہی بات ہند و پاک میں منظر پس منظر میں تھی مگر اب عالمی اخلاق کے ٹھیکیدار اور رواداری کے مبلغ بھی لوگوں پر وطن کی محبت میں اپنے ملک کے دروازے بند کر رہے ہیں۔ یہ خوف کی وہ صورت ہے جس میں اپنا سایہ بھی مشکوک لگنے لگتا ہے۔ ان افسانوں میں پاکستان کی تاریخی صورتحال کو بیان کیا گیا ہے۔

تاریخ میں سماجی، ثقافتی، عمرانی اور سیاسی میدانوں میں ہونے والی تبدیلیوں کا بیان ان افسانوں کے موضوعات ہیں۔ ان کی توجہ کا محور بحیثیت قوم ہمارا رویہ ہے۔ بڑی سے بڑی خرابی اور سانحات پر بھی سطحی ردعمل حیرت انگیز ہے۔ دوراندیشی کا فقدان المیہ سے کم نہیں۔ انتظار حسین اپنے تہذیبی موقف کی وضاحت کرتے لکھتے ہیں:

> "مجھے تو اب کچھ یوں لگتا ہے کہ اس برصغیر میں جو سانحے گزرے ہیں اور جس تکلیف و اذیت میں یہ سارا علاقہ مبتلا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہی ہے کہ اس برصغیر کی تاریخ

جس طرح بن رہی تھی اور جو تہذیب نشو نما پا رہی تھی، اس میں کچھ طاقتوں نے کھنڈرت ڈال دی اور اس عمل کو روک کر اس پورے برصغیر کو اور اس کی پوری خلقت کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا۔" (۸)

ایسے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صدیوں کے تاریخی عمل اور تہذیب کے معاشرتی روپ پر زور دے رہے ہیں۔ انتظار حسین نے ماضی کو حال سے جوڑ کر تجربات کو مدغم کر کے ایسا ادب تخلیق کیا جو اجتماعی شعور کا آئینہ دار ہے۔ اُن کی کہانی کشتی کے بارے میں فتح محمد ملک نے لکھا ہے:

"۔۔۔ انتظار حسین عالمی تہذیبی پس منظر تخلیق کرتے ہیں اور گل گاش کی داستان ہنو سمرتی طوفان نوح کے قرآنی قصے اور حاتم طائی کی داستان یعنی قرآن کی زبان میں اساطیر الاولون کی نئی تشکیل سے طوفان میں ڈولتی ہوئی کشتی کا تہہ در تہہ مفہوم سے لبریز استعارہ تخلیق کرتے ہیں۔" (۹)

انتظار حسین کی کہانیاں ایک خاص عہد کا المیہ ہونے کے باوجود عفریت سے بلند ہیں۔ انسانی تاریخی ورثے میں جو مسائل ابدی حیثیت کے حامل ہیں۔ ان سب کا ذکر ان میں موجود ہے۔ وہ اشخاص جو خالق کے طرف دار ہیں وہ تہذیب آشنا ہیں وہی ان افسانوں اور کہانیوں کے ہیرو ہیں۔ وہ ہر قسم کی نفرت اور تعصب سے پاک ہیں جو تعمیر کردار میں مگن ہیں۔ ایک بستی اجڑ جانے پر وہ نئی بستی بسا لیتے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انتظار حسین نے اپنے نظریات کو اپنے افسانوں میں بڑی خوبی سے برتا ہے۔ وہ مغربی تہذیب سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ اپنی تہذیبی شناخت پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔ اُن کے ہاں احساس تفاخر بھی موجود ہے جو ہمیں ہماری حیثیت سے آگاہ کرتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ انتظار حسین، گلی کوچے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص: ۳۳۔

۲۔ انتظار حسین، جنم کہانیاں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، جلد اول، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۳۱۔

۳۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، طبع دوئم، ۱۹۹۹ء، ص: ۲۲، ۲۱۔

۴۔ جمال پانی پتی، نفی سے اثبات تک، کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۰۲ء، ص: ۱۰۷۔

۵۔ میرا ادیب، مٹی کا دریا، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، طبع دوئم، ۱۹۸۴ء، ص: ۴۳۔
۶۔ انتظار حسین، قصہ کہانیاں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، جلد دوئم، ۱۹۹۸ء، ص: ۲۴۔
۷۔ انتظار حسین، خیمے سے دور، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص: ۸۰۔
۸۔ گوپی چند نارنگ، اُردو افسانہ: روایت اور مسائل، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱ء، ص: ۵۲۵۔
۹۔ فتح محمد ملک، تردید و تحسین، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص: ۸۱۔